بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم الحرام ۱۳۹۴ھ کے اختتام اور صفر المظفر کے آغاز کے دو چار دن نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ایام میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں سے ایک کو نرم ترین الفاظ میں ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کے سیاہ باب کا نہایت ہی اندوہناک عنوان کہا جا سکتا ہے، یا ایک ایسا المناک حزنیہ جس نے ہر شعور و احساس رکھنے والے مسلمان کو شدید کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اپنے آپ کو ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم پاتا ہے جس میں دور دراز تک اسے روشنی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی افسردگی اور بے بسی کا اندازہ اقتدار کے نشہ میں بدمست مگر عوام کی جھوٹی محبت کا دم بھرنے والے افراد نہیں کر سکتے۔ ان کے غم و اندوہ کو کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے وزیر اعظم بھٹو کی زبان سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے منحوس اعلان کو عوام پر برق بن کر گرتے دیکھا۔ ہم اس ضمن میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ عوام کی نبضوں پر ہاتھ رکھنے والے اس صاحبِ اقتدار کو عوام کے ردِ عمل کا صحیح احساس ہے یا نہیں لیکن ایک بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح فیلڈ مارشل محمد ایوب کے لیے معاہدۂ تاشقند، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی ظفر مندی کے باوجود، اس کے زوال کا باعث بنا، بالکل اسی طرح بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا وزیر اعظم بھٹو کے لیے نقطۂ انحطاط ثابت ہو گا۔

ہم نہیں جانتے کہ مسٹر بھٹو کسی خوش فہمی کی بنا پر یا تجاہلِ عارفانہ کے تحت اس عظیم حادثہ کو ملک کے حق میں نیک فال قرار دے رہے ہیں مگر انہیں اس بات کو بخوبی جان لینا چاہیے کہ چند مفاد پرست لوگوں کے بیانات خواہ وہ گھر کے ہوں یا باہر کے، تلخ حقائق کو خوش کن حالات میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ جہاں تک گھر کے مفاد پرستوں کا تعلق ہے گزشتہ ۲۵ سال میں ضمیر فروشی کی تربیت نے انہیں دنیوی مفادات کا اس حد تک پرستار بنا دیا ہے کہ بنگلہ دیش کے معاملے میں وزیر اعظم کی تائید و حمایت تو ایک طرف رہی اگر وہ پورا ملک بھی کسی سامراجی قوت کے سامنے بطور تحفہ پیش کر دیں تو یہ لوگ صاحبِ اقتدار کے اس اقدام کو بھی اس وقت تک سراہتے رہیں گے جب تک کہ وہ مسندِ اقتدار پر فائز ہیں۔ لیکن جس وقت وہ اس سے محروم ہوں گے اور

اُن کی جگہ کوئی دوسرا اس پر قابض ہوگا تو پھر یہ نئے مقتدر کے ہر اقدام کی تعریف و توصیف شروع کر دیں گے اور سابق حکمران کے ہر کام کو ملک و ملت سے غداری پر محمول کریں گے۔ اِس لیے ان ضمیر فروشوں کے ستائشی کلمات سے وزیر اعظم صاحب کو خوش نہ ہونا چاہیے۔ یہ لوگ تو ہر اُس شخص کے ثناخواں ہیں جس کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہوتی ہے اور ہر اس شخص سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں جو اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔

اقتدار کے ان پجاریوں کے علاوہ مسٹر بھٹو کو ان اسلام دشمن عناصر کی تائید سے بھی خوش نہ ہونا چاہیے جو اس خطہ پاک کی دینی حیثیت کو مٹانے کے درپے ہیں اور جنہیں یہ تصور بھی شاق گزرتا ہے کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو۔ انہیں اشتراکیت کی سربلندی مطلوب ہے اور اسی کی خاطر وہ ہر اس اقدام کی تائید پر آمادہ رہتے ہیں جس سے اسلام کی بجائے کفر کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے چونکہ دین کی اساس پر قائم ہونے والے تصورِ ملت کو شدید دھچکا لگا ہے اور بقول اندرا گاندھی اُس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مذہب انسانیت کے کسی گروہ کے مابین رشتہ اخوت قائم کرنے میں ناکام رہا ہے" اس لیے اشتراکیت کے مُبلّغ اور حامی اور دوسرے لادین عناصر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔

وزیر اعظم بھٹو کے فیصلے پر مسرت کا اظہار ایک ایسا طبقہ بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس کی تائید سے انہیں اطمینان خاطر حاصل ہونے کے بجائے پریشان ہونا چاہیے کہ اُن کی حمایت ایسے گھٹیا لوگ کر رہے ہیں جن کی سوچ کی حدِ کمال یہ ہے کہ اس معاہدے سے بھارت کے ساتھ تعلقات بحال کرنے میں مدد ملے گی اور بالآخر اُن کے لیے بھارتی فلمیں دیکھنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ جن لوگوں کی فکر اتنی پست ہو اُن کی کسی مسئلہ کے بارے میں تائید و حمایت قومی زندگی میں آخر کیا اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ وزیر اعظم بھٹو اس وقت جن لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ انہیں اصل حقائق سے کبھی بھی آگاہ نہ ہونے دیں گے اور انہیں یہی باور کراتے رہیں گے کہ اُنہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے قوم پر جو عظیم احسان کیا ہے پوری قوم اس کے لیے ان کی شکر گزار ہے اور اُن کے اس سنہری کارنامے پر انہیں ہدیۂ تبریک پیش کر رہی ہے۔ لیکن اگر وہ ان خوشامدیوں کے نرغے سے کبھی باہر نکل کر لوگوں کے ردِّ عمل کا جائزہ لیں تو اُن پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ قوم کی عظیم اکثریت اُن کے اس فیصلے کو دل کی گہرائیوں سے غلط اور سخت عاقبت نا اندیشانہ سمجھتی ہے جس نے ان کے وقار کو مجروح کر دیا ہے۔ قوم اس وقت اگر خاموش اور مُہر بلب ہے تو اس سے اُنہیں یہ نتیجہ نہ اخذ کر لینا چاہیے کہ "یہاں سب اچھا ہے" اور قوم نے اُن کے فہم و تدبّر پر بھروسہ کرتے ہوئے اُن کے اس فیصلے کی توثیق کر دی ہے اور اُسے اُن کی اِس بات کا پورا یقین ہو چکا ہے کہ

تاریخ اس فیصلے کی صحت پر اپنی تصدیق ثبت کر دے گی۔ وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ بے کسی، مجبوری اور بیچارگی کا سکوت اپنی آستینوں میں بہت سے طوفان چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

پھر تاریخ کو جو آپ نے اس معاملے میں بار بار حَکم ٹھیرایا ہے اور حقیقت کو ماننے پر اصرار کیا ہے اس کے بارے میں بھی آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کا باشعور طبقہ اس کی لم سے ناآشنا ہے اور آپ حقیقت پسندی کے نام پر ان کے ذہنی اضطراب اور خلجان کو طمانیت سے بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت نہ سہی مگر ایک اچھی خاصی تعداد "حقیقت پسندی" کے اس فلسفے کے پس منظر، اس کے مضمرات اور نتائج سے بخوبی واقف ہے۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح ہیگل کے اس نظریے نے کہ جو موجود ہے وہی حقیقت ہے اور جو حقیقت ہے وہ صحیح ہے یا دوسرے لفظوں میں جو موجود ہے وہی صحیح ہے، اہلِ یورپ کو زندگی کی اعلیٰ اور ارفع اقدار سے محروم کر کے انہیں پست صورتِ حال سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے والا اور ہر قسم کے ظلم و استبداد، بُرائی اور ذلت کے سامنے سرنگوں ہونے والا بنا دیا۔ ہیگل نے تو یہ فلسفہ آمریت کے فروغ اور کش مکش حیات میں ہر جائز و ناجائز حربے کے استعمال کے جواز کے لیے گھڑا تھا۔ مارکس نے اس فلسفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتراکیت کے علمبرداروں کو اس بات کی تربیت دی کہ انہیں ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کر کے کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کیونکہ ان کا اقتدار پر تسلط ہی ان کے صحیح اور برحق ہونے کی واضح دلیل ہے اور عوام کے اندر حقیقت پسندی کے اس فلسفے کا اس لیے پرچار کیا گیا کہ وہ جور و جفا کو حقیقت مان کر اس پر راضی ہو جائیں۔ اگر حقیقت پسندی کے فلسفے کے مضمرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ ہر فرد اور گروہ اور طبقے اور معاشرے کے لیے اس کے مخصوص حالات کے پس منظر میں الگ الگ مفہوم اور معانی رکھتا ہے۔ جباروں، سفاکوں، ظالموں اور زبردست آزاروں کو اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے اس سے سندِ جواز فراہم ہوتی ہے اور کمزوروں، بے بسوں اور مجبوروں کو ظلم و استبداد کے مقابلے میں اعترافِ شکست کی تربیت ملتی ہے۔

حقیقت پسندی کے اس سارے فلسفے میں سب سے بڑا منطقی مغالطہ یہ ہے کہ جو کچھ معرضِ وجود میں آ جائے اُسے صحیح اور برحق تسلیم کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اگر ایک واقعہ ہو گیا ہے تو وہ بلا شبہ حقیقت ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس حقیقت کو صحیح اور برحق بھی مان لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر ایک قاتل کسی بے گناہ انسان کو قتل کر دیتا ہے تو یہ حقیقت تو ضرور ہے لیکن کیا اس حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ قاتل نے مقتول کو بڑی کامیابی کے ساتھ قتل کیا ہے، اس لیے اس کا یہ فعل صحیح اور درست بھی ہے اور

ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کی صحت کا اعتراف کریں۔ اصل چیز حقائق کا اعتراف نہیں بلکہ اُن حقائق کے صحیح اور غلط ہونے کا شعور اور اُن کے بارے میں صحیح ردِّ عمل کا ہے۔ مثلاً چند بدقماش افراد کسی غریب شخص کی بچی کو بالجبر اغوا کر لیتے ہیں۔ اب وہ بے کس شخص اس حقیقت کا کس طرح سامنا کرتا ہے اس کا سارا دارومدار اس طرزِ عمل پر ہے جو وہ اس ظلم کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ ایک طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، آبادی کے شرفاء کے احساسِ شرافت کو ابھارتا ہے، اپنے اقربا کی غیرت کو بیدار کرتا ہے، جن جن افراد اور حلقوں کے بارے میں اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجرموں پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر اس کی مظلوم بچی کی بازیابی میں کسی طرح مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک وہ اس مظلومہ کو ان کے چنگل سے نجات نہیں دلا لیتا اور اس مقصد کے لیے وہ جان و مال ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دُوسرا شخص اس اندوہناک تلخ حقیقت کا اعتراف کہ اس کی بچی کو چند بدمعاشوں نے اغوا کر لیا ہے، اس طرح کرتا ہے کہ بچی کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ جس شخص کے گھر میں وہ محبوس ہے اُسے داماد کے طور پر تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ اسی طرح کے راہ و رسم بڑھانے کے لیے کوشاں رہتا ہے جس طرح کہ داماد اور اس کے دوسرے اقارب کے ساتھ بڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بھی اعترافِ حقیقت ہی کی ایک صورت ہے لیکن دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں اعترافِ حقیقت نے ایک غیور شخص کی غیرت کو اُبھارا اور اس کے دل میں ظلم کے خلاف شدید ردِّ عمل پیدا کیا اور دوسرے شخص نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے غیرت کو تیاگ دیا، اور ظالم کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہوا۔

جن باتوں کو ہم حقائق کہہ کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہ فطرت کے کوئی ایسے لگے بندھے ضابطے نہیں ہوتے جنہیں تبدیل نہ کیا جا سکے۔ یہ معاشرتی حقائق انسان کی قوتِ عمل سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورج کا ایک خاص سمت میں سفر ایک ایسی حقیقت ہے جس میں انسان کوئی تغیّر و تبدّل نہیں کر سکتا مگر تاریخ کے رُخ کو اپنی ہمت سے جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک حقیقت تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں بے بس تھے اور کفار مکّہ ان کے مقابلے میں طاقتور تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس حقیقت کے باوجود حضورؐ نے کفر کو ایک بالاتر قوت کے طور پر کبھی تسلیم نہ کیا اور وہ خود اور ان کے رفقائے کار اس یقین کے ساتھ جد و جہد کرتے رہے کہ حق کو بہر حال غالب ہونا اور باطل کو مٹنا ہی ہے۔ اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے فتنۂ مانعین زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد خوفناک حقائق کی صورت میں نمودار ہوئے مگر انہوں نے ان کے ساتھ کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا کی اور کفر کی یلغار کے یہی ٹھوس حقائق خواب

پرِ بیشاں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئے۔

معاشرتی حقائق کا چونکہ اخلاق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے اخلاق کی معمولی حس رکھنے والے افراد اور قومیں ان حقائق کو اسی وقت تسلیم کرتی ہیں جب اُن کی نگاہ میں اُن کے وجود کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہو۔ کشمیر ربع صدی سے بھارت کے قبضے میں ہے اور یہ ایک حقیقت ہے لیکن پاکستان اس حقیقت کو اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ بھارت کا اس خطے پر قبضہ عدل و انصاف کے سراسر منافی ہے۔ جس اصول پر ملک کی تقسیم ہوئی تھی اس کی رو سے مسلم اکثریت کے اس علاقے کو پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔ بھارت نے ننگی جارحیت کا مظاہرہ کرتے اور عدل و انصاف کے سارے ضابطوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے پاکستان کے اس حصے پر بالکل ناجائز طور پر قبضہ کر لیا۔ اب اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لو تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ ہمیں یہ درس دے رہا ہے کہ تم بھارت کی جارحیت اور اس کے اس ناجائز قبضہ کو برحق مان لو۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے پر روس قابض ہو گیا اور دوسرا حصہ امریکہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس ملک کی دو حصوں میں تقسیم بالکل حقیقت ہے جس پر ساری دُنیا گواہ ہے مگر گزشتہ تیس سال سے المانیہ کے باشندے اِس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے کیونکہ وہ اس تقسیم کو غلط اور جارح اقوام کے اس فیصلے کو ناانصافی پر مبنی سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک نہیں متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کے تخلیق کردہ حقائق کا اعتراف اسی وقت کیا جاتا ہے جب وہ اخلاقی اعتبار سے تسلیم کرنے کے قابل ہوں اور اگر اس نقطہ نظر سے وہ صحیح نہ ہوں تو انہیں پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں تاریخ کے فیصلے کا ذکر فرماتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط ہُوا ہے تو مستقبل اسے غلط قرار دے کر مٹا دے گا اور اگر یہ صحیح ہُوا ہے تو مستقبل اس کی صحت کی تصدیق کر دے گا۔ تاریخ کا فیصلہ بلاشُبہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن وزیراعظم کو اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تاریخ کے جس فیصلے کا وہ ذکر فرما رہے ہیں یہ وہ فیصلہ نہیں جس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں انسانی فہم کچھ سوچنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ کسی فرد کی کوئی ذاتی امر بھی نہیں جس کی صحت کی تصدیق بغیر کسی بہت بڑی قربانی کے آسانی کے ساتھ کی جا سکے۔ معلوم نہیں کہ انہیں اس بات کا احساس ہے یا نہیں کہ وہ اپنے جس اقدام کے بارے میں تاریخ کے فیصلے کے طلبگار ہیں اس کا تعلق ان کی ذات سے کہیں زیادہ اُن کی قوم بلکہ پوری ملت اِسلامیہ سے ہے اور جس چیز کو وہ تاریخ کے فیصلے کا نام دے رہے ہیں وہ درحقیقت وہ انجام ہے جس پر وہ قوم کو پہنچا

کہ اس کا حشر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی حساس اور صاحب بصیرت شخص اپنے آپ کو یا اپنے اہل و عیال کو انجام کے سپرد کر کے اپنے کسی فعل کے نتائج دیکھنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی دانشمند شخص اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے لختِ جگر کو آگ میں جھونک کر یا اُسے بُری صحبت میں گرفتار کر کے اس کے بھیانک انجام سے اُسے آگاہ کرے۔ دردمند لوگ تو ان افراد کو بھی حوادث کی اُن بے مروت لہروں کے سپرد کرنا گوارا نہیں کرتے جو اُنہیں خوفناک انجام سے دوچار کر دیں۔ وہ انہیں اُن کی دستبرد سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ کُجا آپ کہ اپنی قوم کو حوادث کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر انہیں انجام سے آگاہ کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید نے نوعِ انسان کو گزرے ہوئے حالات و واقعات سے عبرت پکڑنے کی جو بار بار تلقین کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوعِ بشری انسان کی غلط روش خصوصاً جب کہ یہ روش اجتماعی معاملات میں ہو، کی تباہ کاریوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں رکھتی اس لیے اسے اس خطرناک راہ سے بار بار گزرنے سے متنبہ کیا جاتا ہے اور اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اُن کے انجام کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان خوفناک راہوں سے بچانے کی فکر کرے۔ انسان تو کسی بے جان شے پر ایک تجربہ گاہ کے اندر بھی کوئی خوفناک تجربہ کرتے ہوئے سخت خوف محسوس کرتا ہے وہ آخر ذی روح انسانوں کی زندگی کے ساتھ وسیع تر انسانی برادری کے دائرے میں آگ کا کھیل کھیلنا کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ جب کہ اُسے ماضی کے واقعات صاف طور پر بتا رہے ہوں کہ اس خطرناک کھیل سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں ہم اس قسم کے تجربات بار بار کر کے ان کا بھیانک انجام دیکھ چکے ہیں۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے یو۔ این۔ او کے کہنے پر کشمیر میں فائر بندی کا جو اقدام کیا اس کے نتائج قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا جو فیصلہ کیا اس سے ان کی ذات کو تو اس کے علاوہ اور کوئی نقصان نہ پہنچا کہ مہذب دُنیا میں ان کی رسوائی ہوئی مگر قوم آمریت کی زنجیروں میں جکڑی گئی۔ فیلڈ مارشل ایوب صاحب نے مارشل لا نافذ کر کے اپنی دانست میں اصلاح احوال کا ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ مگر تین چار سال کے تجربات نے ہی انہیں اس راہ کی تباہ کاریوں سے روشناس کرا دیا، چنانچہ وہ خود تو ہر چیز چھوڑ چھاڑ کر آرام سے ایک طرف بیٹھ گئے اور آمریت کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں قوم آ گئی۔

بالکل یہی حال بھٹو صاحب کے اس فیصلے کا ہے جس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں وہ عوام کو تاریخ کی عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ تاریخ اپنا فیصلہ اس وقت تک محفوظ رکھتی ہے جب تک کہ کوئی قوم اپنے کیے کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتی۔ جس طرح لیاقت علی خاں کے اقدام، غلام محمد کے اقدام،

جسٹس محمد منیر کے اقدام، فیلڈ مارشل ایوب صاحب کے اقدام، اور خود اُن کے اپنے اس اقدام کہ انہوں نے اکثریتی پارٹی کے حکومت کرنے کے حق کو تسلیم نہ کیا، کے ہولناک نتائج سے خود تو محفوظ رہے مگر ان کی ہولناکیوں سے قوم بچ نہ سکی۔ بالکل اسی طرح بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا دوسرے لفظوں میں بھارت کی اندھی بہری جارحیت کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے انجام سے خود تو محفوظ و مامون رہیں گے۔ لیکن اس غلطی کا خمیازہ ان لوگوں کو بھگتنا پڑے گا جن کا اس فیصلے میں قطعاً کوئی ہاتھ نہ ہوگا۔ آخر یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ قوم کا کوئی سربراہ اپنے ذاتی مصالح اور رجحانات کے پیش نظر ایک فیصلہ کرے اور پھر قوم سے یہ کہے کہ تم اس کی تباہ کاریوں کا سامنا کرو۔

گزشتہ ۲۵ سالوں میں ہمارے سربراہوں نے وہ کونسا ایسا فیصلہ کیا ہے جس کے نتائج اس ملک کے سنجیدہ طبقوں کے خدشات کے برعکس رونما ہوئے ہیں۔ اس ملک کی عظیم اکثریت حکمرانوں کو بار بار اس بات کی طرف متوجہ کرتی رہی ہے کہ اسلام کے بغیر اس ملک کا بقا ناممکن ہے اس لیے اللہ کا جو دین ہماری قومی زندگی کے لیے شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے معاملے میں خلوص اور سنجیدگی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے مگر ہمارے حکمرانوں نے اس صحیح مشورے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے جس رشتے نے یہاں کے مائل بہ انتشار اجزا کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا وہ کمزور ہوتا گیا اور پاکستانی قوم چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹنے لگی اور اُن میں سے ہر ایک نے علیحدگی کا مطالبہ شروع کیا۔ مشرقی پاکستان بھی اس رشتے کے مضمحل ہونے کی وجہ سے بنگلہ دیش کے نام پر ایک لادینی ریاست میں تبدیل ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ کیا کسی ایک مرحلے پر بھی قوم کے بہی خواہوں نے حکمرانوں کو اُن کے غلط اقدام پر تنبیہ کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے غلام محمد کو بروقت تنبیہ کیا، فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کو مختلف مراحل پر بڑی دلسوزی کے ساتھ اُن کے بعض فیصلوں کی غلطی دلائل کے ساتھ ان پر واضح کرنے کی کوشش کی، سہروردی اور سکندر مرزا کے مخلوط انتخاب کے معاملے میں بے جا اصرار کے نتائج سے پوری قوم کو روشناس کیا، پھر شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی پروگرام، صدر یحییٰ کی پے در پے حماقتوں اور بھٹو صاحب کی اُدھر تم اور اِدھر ہم کی رٹ کے خطرناک عواقب کی نہایت واضح الفاظ میں نشان دہی کی مگر افسوس کہ حکمرانوں نے ان کی ایک نہ سُنی اور قوم کو تباہی کے راستے پر مسلسل آگے بڑھاتے گئے۔

ہم سقوط ڈھاکہ سے لے کر آج تک یہ بات برابر کہہ رہے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ایک عاقبت نااندیشانہ فیصلہ ہے اور آج پھر کسی فرد یا گروہ کی دشمنی میں نہیں، کسی سطحی جذباتیت کے زیر اثر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ وزیر اعظم بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ (باقی صفحہ ۲۴ پر)

(بقیہ اشارات) وزیر اعظم سے یہ بات مخفی نہیں کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے خود الگ نہیں ہُوا بلکہ بھارت اور مغرب کی اسلام دشمن طاقتوں، خصوصاً بھارت اور روس کی سازشوں سے یہ المیہ رونما ہُوا ہے۔ اس کام میں بھارت کے ہندو، پاکستان کے سوشلسٹ اور دوسرے لادین عناصر روس کی سرپرستی میں ہمہ تن مصروف تھے کہ کسی طرح دین کی اساس پر قائم ہونے والے اس ملک کی تباہی کا سامان پیدا کیا جا سکے۔ ان لوگوں کے مذموم عزائم کے پیچھے تین محرکات کارفرما ہیں۔ ایک چین کے مقابلے میں مشرق کے اندر عظیم بھارت کی تشکیل جس کے ذریعے امریکہ اور روس کے سامراجی مفادات کی تکمیل ممکن ہو۔ دوسرے اسلام کی عملداری کا خاتمہ اور اس سے ملت اسلامیہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا ناپاک منصوبہ اور تیسرے دونوں بازوؤں میں آمریت کے تسلط کی راہ کی ہمواری۔ اسلام دشمن طاقتیں ان تینوں مقاصد کی تکمیل کے لیے برسوں سے مصروفِ عمل تھیں، جن کے نتائج اب کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر ان طاقتوں کو یہ موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ بڑی آزادی بلکہ ہماری رضامندی کے ساتھ ان خوفناک منصوبوں کو کامیابی کے مراحل تک پہنچائیں۔

اخلاقی اور قانونی اعتبار سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب بجز اس کے کیا ہے کہ جارح ہندوستان کو، جسے اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ممالک نے بھی جارح قرار دیا ہے، نہ صرف جارحیت کے الزام سے بری تسلیم کیا جائے بلکہ اسے بنگلہ دیش میں "آزادی کی جنگ کرنے والوں کا نجات دہندہ" مانا جائے اور اس طرح استعماری طاقتوں کو یہ راستہ دکھایا جائے کہ پہلے پاکستان کے کسی حصے میں علٰحدگی کے رجحانات کی پرورش کرو اور پھر جب چند سر پھرے باہر کی قوتوں کا اشارہ پا کر اس حصے میں شورش برپا کر دیں تو اُسے آزادی کی جنگ کا مقدس نام دے کر ان شورش پسندوں کی تائید کے لیے اپنی مسلح افواج کے ساتھ آدھمکو اور اس طرح اس حصے پر قابض ہو جاؤ اور پاکستان سے یہ مطالبہ کرو کہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ناجائز قبضے کو صحیح اور درست مان لے۔ ممکن ہے بھٹو صاحب بھارت کے بارے میں کسی خوش فہمی میں گرفتار ہوں لیکن جو لوگ بھارت کی سامراجی ذہنیت سے واقف ہیں اُن کے لیے یہ باور کرنا قریب قریب ناممکن ہے کہ بھارت اور اُس کے روسی آقا صرف مشرقی پاکستان کو ہضم کر کے سیر ہو جائیں گے اور ان میں ھل من مزید کی کوئی حرص باقی نہ رہے گی۔ بھارت نے اس سے پیشتر جوناگڑھ پر ہاتھ صاف کیے، کشمیر پر ناجائز قبضہ جمایا، حیدرآباد کو ہڑپ کیا اور اس کی جوع الارض میں کوئی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ وہ آہستہ آہستہ اردگرد کی ریاستوں کو نگل جانے کے درپے ہے۔ اور وہ خود بھی اور اُس کا مُربّی روس بھی پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان میں جہاں کہیں بھی آزادی کی کوئی تحریک اُبھرے گی وہ اسی طرح نجات دہندہ بن کر اس کی حمایت پر آئیں گے جس طرح کہ بنگلہ دیش کے لیے میدانِ عمل میں اُترے ہیں۔ ہم محترم وزیر اعظم سے دریافت کرتے ہیں کیا وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان نئے اندوہناک حقائق کو، جنہیں یہ سامراجی قوتیں مناسب مواقع پر جنم دیتی رہیں گی، تسلیم کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ اگر آپ اتنے ہی حقیقت پسند

ہیں تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ جس جماعت نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے اُسے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ پھر آپ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ آپ نے یہ فیصلہ دوستوں کے مشورے سے کیا ہے۔ کیا اس فیصلے کے لیے وہ وقت زیادہ موزوں اور مناسب نہ تھا جب پولینڈ کی قرارداد کے ذریعے ایک ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی جس سے ملک تقسیم ہونے سے بچ جاتا مگر آپ اس قرارداد کو پھاڑ کر اور بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں لوٹ آئے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر آپ بنگلہ دیش کے معاملے ہی میں کیوں اتنے حقیقت پسند ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو مگر ہمیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں آزاد بلوچستان، پختونستان اور سندھو دیش بھی سامراجی طاقتوں کے اشارے پر حقائق کی صورت میں ہمارے سامنے نمودار نہ ہونے لگیں اور پھر ہم ان حقائق کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیے جائیں۔

بنگلہ دیش کے مسئلہ پر آپ کی تقریر دلپذیر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بنگال کے مسلمانوں سے ایک سال کی جدائی نے آپ کے اندر ان سے ملنے اور اُن کے ساتھ شیر و شکر ہونے کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک بڑا نیک جذبہ ہے اور دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کو ملانے کی خواہش بڑی مقدس خواہش ہے لیکن اس ضمن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آخر اس نیک جذبے کا اُس وقت کیوں مظاہرہ نہ کیا گیا جب آپ کے معمولی ایثار سے جدائی کے امکانات ہی معدوم ہو سکتے تھے۔

شیخ مجیب الرحمٰن جس مزاج کے آدمی ہیں اور وہ اِس وقت جس طرح اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے بھارت کے دست نگر ہیں، کیا ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی اس بات کا کوئی امکان موجود ہے کہ ہم بنگال کے مسلمانوں کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بھارت ہماری ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھے گا اور وہ ایک لمحہ کے لیے ہمارے کسی ایسے طرزِ عمل کو گوارا نہ کرے گا جس سے مشرقی بنگال کے مسلمان بھارت کے اثر سے آزاد ہو کر پاکستان کے اثر میں آجائیں۔

بنگلہ دیش بھارت کی غلامی میں جس طرح جکڑا ہوا ہے اُس کا ممکن ہے عوام کو اندازہ نہ ہو مگر آپ تو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ۲۵ سالہ معاہدے کی رُو سے بنگلہ دیش کی تجارت، اس کی خارجہ پالیسی، اس کا نظامِ زر، سب بھارت کے تابع ہیں۔ بنگلہ دیش بھارت کی اجازت کے بغیر اپنی کوئی فوج نہیں رکھ سکتا۔ بھارت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی نوٹس کے بنگلہ دیش میں اپنی فوج داخل کر دے۔ ان حالات میں بنگلہ دیش کے عوام کے ساتھ کوئی راہ و رسم پیدا کرنے کا خیال ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہم بھٹو صاحب کے اس رویہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پاکستان سے علٰحدگی کے سب سے بڑے علمبردار اور اُن کے حامیوں سے تو تعلقات استوار کرنے کے لیے وہ سخت بیتاب ہیں لیکن انہیں اُن مسلمانوں کے دُکھ درد کا کچھ احساس نہیں جنہوں نے ایک پاکستان کے

قیام کے لیے بے مثال قربانیاں دیں اور جو آج بھی اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ بھارت کے چنگل سے نکل کر پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ان لوگوں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ مجیب الرحمٰن کے قول کے مطابق ایک کروڑ ہے اور اس کشمکش میں برسرِ اقتدار پارٹی کے اخبار کی اطلاع کے مطابق، قریب قریب ایک سو نمایاں افراد قتل ہو چکے ہیں۔ یہ سب حقائق کیا اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان اس زبردستی قائم ہونے والے بنگلہ دیش سے راضی نہیں۔ اس حالت میں کیا ہمارا اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرنا ان بے چاروں کی پشت میں چھرا گھونپنے کے مترادف نہیں۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے اُن بہاریوں کو بھی نگاہ میں رکھنے کی ضرورت تھی جو پاکستان کی خاطر پہلے ۱۹۴۷ء میں برباد ہوئے اور اب ایک پاکستان کی حمایت کے جرم میں بنگال کے لادین عناصر کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان بے چاروں کا کس وسیع پیمانے پر قتل ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت کے ایک ترجمان کے مطابق ۲ لاکھ ۸۰ ہزار بہاریوں نے اپنے مستقبل کا فیصلہ معلّق رکھا ہے۔ ایک لاکھ ۸۰ ہزار بنگلہ دیش میں رہنے پر مصر ہیں اور ایک لاکھ ۸۰ ہزار نے مغربی پاکستان میں آباد ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بہاریوں کی کُل آبادی ۳۵، اور چالیس لاکھ سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اگر ہم ۳۵ لاکھ ہی تسلیم کر لیں تو ان چھ لاکھ بہاریوں کے علاوہ باقی ۲۹ لاکھ کہاں گئے۔ کیا اُنہیں زمین نگل گئی یا آسمان اُچک کر لے گیا۔ اگر مشرقی پاکستان کے بپھرے ہوئے لادین عناصر نے اُنہیں موت کے گھاٹ نہیں اُتارا تو انہیں کیا ہُوا ہے۔ کیا یہ بیچارے اس بات کے مستحق نہیں کہ ہم ان ستم زدوں کی دلجوئی کرتے ہوئے ان عناصر کو اپنے سے دُور رکھنے کا التزام کریں جنہوں نے ہندو کے ایما پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے۔

جس ڈرامائی انداز سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی فوج کے جذبات اور صوبائی حکومت کے ان کارکنوں کے احساسات کو کبھی کسی لحاظ سے قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا جنہوں نے بھارتی جارحیت کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور نہایت پُرآشوب حالات میں مشرقی پاکستان کے انتظام و انصرام کو سنبھالا۔ کیا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد ہماری فوج اور انتظامیہ کے اندر داخلی اور خارجی شورشوں کو پوری قوت سے دبانے کا کوئی داعیہ باقی رہے گا۔ کیا وہ اس فیصلے کے بعد اس انداز پر سوچنے میں حق بجانب نہ ہوں گی کہ شورش پسندوں کی سرکوبی کرنے کے بجائے خاموش تماشائی بن کر حالات کا رُخ دیکھتے رہو اور اگر شورش پسند قوت و طاقت حاصل کرتے نظر آئیں تو پھر اُن کے ساتھ شامل ہو کر آزادی کے علمبردار بن جاؤ۔ بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہوئے یہ تو فرمایا ہے کہ انہوں نے یہ قدم دوستوں کے مشورے سے اٹھایا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کے اس دوست کا اس بارے میں کیا ردِّ عمل ہے جس نے ہماری ہر آڑے وقت میں مدد کی اور جو روس کی اس شاطرانہ چال کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح وہ ایک منصوبے کے تحت بھارت کی وساطت سے اُس کے

اردگرد اپنا حلقہ تنگ کرتا جا رہا ہے۔ کیا چین اور دوسرے ایسے تمام ممالک جنہوں نے ہمیں صحیح اور برحق سمجھتے ہوئے بنگلہ دیش کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا بلکہ بھارت اور روس سے لڑائی مول لے رکھی ہے انہیں بھی اس مشورے میں شامل کیا گیا ہے۔ اندرونی حالات سے تو ہم واقف نہیں لیکن ظاہری حالات صاف بتا رہے ہیں کہ جس فنکاری کے ساتھ ہمارے وزیر اعظم نے بنگلہ دیش تسلیم کیا ہے اُس سے اس ملک کے عوام کو تو ممکن ہے کسی حد تک دھوکہ دیا جا سکے مگر زیرک مدبّروں کو دھوکہ نہیں دیا جا سکے گا۔ اور اگر یہ قدم ان کے مخلصانہ مشورے اور رضامندی کے بغیر اُٹھایا گیا ہے تو پھر یہ ہمارے لیے کسی طرح بھی اچھا نہ ہوگا کیونکہ اس سے عالمی برادری میں ہمارا وقار بالکل گر جائے گا اور ہمارے کسی قول اور مؤقف پر ہمارے دوستوں کو اعتماد نہ رہے گا اور اس سے ہمیں جو نقصان اُٹھانا پڑے گا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ہم پوری دیانت داری سے اسے حکمران طبقوں کی محض خام خیالی سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی موجودہ حکومت کے ساتھ جو ایک لادینی اور نسلی ریاست ہے تعلقات اُستوار ہونے سے مسلم بنگال کے ساتھ تعلقات بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ ہمیں تو یہ خطرہ لاحق ہے کہ ان تعلقات کی آڑ میں اس خوفناک لابی کو جو بھارتی ہندوؤں اور روس نواز اشتراکیوں اور دوسرے لادینی عناصر پر مشتمل ہے اور جس نے مشرقی پاکستان کو تباہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے، اسے مغربی پاکستان میں جہاں اسلام دشمن عناصر پہلے سے مصروفِ عمل ہیں، کام کرنے کا وسیع میدان ہاتھ آجائے گا اور چونکہ اسی لابی کو مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کا اچھا خاصا تجربہ حاصل ہو چکا ہے اس لیے وہ مغربی پاکستان میں بھی اپنی مذموم کارروائیوں کو زیادہ ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ جاری رکھ سکے گی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور ان عناصر کے خطرناک منصوبے خاک میں مل جائیں۔ مگر اس قسم کے خدشات کو خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا ہے، خصوصاً ان حالات میں جب کہ بھارت اور روس آزادی کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے فرائض سر انجام دینے پر مصر ہیں اور پوری دُنیا اُن کے تصورِ آزادی اور اُس کے مضمرات سے بھی بخوبی واقف ہے۔

ہمیں اس بات کا شدید رنج ہے کہ جن صفحات میں ہم بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے سانحہ کا ذکر کر رہے ہیں اُنہیں صفحات میں ہمیں اسلامی سربراہی کانفرنس کے بارے میں ایک دو ضروری باتیں عرض کرنا پڑ رہی ہیں، لیکن ہمیں اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نظر نہیں آتا کیونکہ وزیر اعظم بھٹو صاحب نے اپنی بے تدبیری یا غیر معمولی ہوشیاری سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا دُنیائے اسلام کے سارے سربراہ لاہور میں جمع ہی

اس غرض سے ہوئے تھے کہ کسی طرح پاکستان پر دباؤ ڈال کر اُسے بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کانفرنس کی جو روداد منظرِ عام پر آئی ہے، اُسے دیکھنے سے اس تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ان نامور فرمانرواؤں کے سامنے یہی ایک سب سے اہم مسئلہ تھا جسے طے کرنے کے لیے وہ بیتاب تھے۔ بھٹو اور مجیب ملاقات کے لیے انور سادات اور ان کے انداز پر سوچنے والے دوسرے سربراہوں کی سرگرمیاں، کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلے کی پذیرائی، پھر انور سادات کی کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی دہلی میں اندرا گاندھی سے ملاقات اور اندرا گاندھی اور روس کے سربراہ کا اس فیصلے کے بارے میں مسرّت و شادمانی کا اظہار اور کرنل قذافی کا پاکستان کے مختلف حصوں کا دورہ اور اس فیصلے کی حمایت میں اُن کا عوام سے خطاب اور شاہ فیصل کا معنی خیز سکوت سب باتیں بہت سے شبہات کو جنم دیتی ہیں۔ اور ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ کانفرنس محض ایک کھیل تو نہ تھا جو اشتراکی لابی کے ایما پر کھیلا جا رہا تھا۔ دُنیائے اسلام کی بے بسی کا اس سے زیادہ تکلیف دِہ منظر کیا ہو سکتا ہے کہ پہلے تو ان اسلام دشمن عناصر نے بھارتی جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کر دیا اور پھر پوری دنیائے اسلام کے سربراہوں کی موجودگی میں میزبان ملک پاکستان کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ بھارت نے جارحیت کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ کچھ زیادتیاں اسی سے سرزد ہوئی ہیں، جن کا ازالہ کرنے کے لیے وہ تیار ہے اور اس سلسلے میں اس پر جو ذمہ داریاں بھی عائد ہوں گی وہ اُن سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گا۔

اگر پاکستان کے حکمرانوں کو غیر ملکی طاقتوں نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر مجبور ہی کر دیا تھا اور وہ اس معاملے میں بالکل بے بس ہو چکے تھے تو زہر کا یہ پیالہ کانفرنس سے پہلے اور کانفرنس کے بعد بھی پیا جا سکتا تھا۔ کیا اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ہم اسے ایک ایسے موقع پر پییں جب پوری دُنیائے اسلام کا جاہ و جلال کفر کی طاقتوں کو اپنی قوت کا احساس دلانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوا تھا۔

پھر بھٹو اور مجیب کے درمیان مصالحت اگر ایک مسئلہ ہے، فلسطین کی آزادی اور بیت المقدس کی بازیابی اگر ایک مسئلہ ہے، اور عرب کے مقبوضہ علاقوں کو یہودیوں کے تسلط سے آزاد کرانا ایک مسئلہ ہے تو مقبوضہ کشمیریوں پر بھارت کا بے جا تسلط اور محکوم کشمیریوں کی دادرسی بھی تو ایک مسئلہ ہی ہے جو دُنیائے اسلام کی توجہ کا اس طرح محتاج ہے جس طرح کہ دوسرے مسائل۔ معلوم نہیں اس مسئلے کو کانفرنس کے شرکا نے کیونکر قابلِ التفات نہ سمجھا اور آزاد کشمیر کے منتخب صدر کو کانفرنس میں شرکت تک کی دعوت نہ دی گئی درآنحالیکہ آزادیٔ فلسطین کے علمبردار یاسر عرفات جس کی ایک انچ خطۂ زمین پر بھی حکمرانی نہیں اسی طرح پذیرائی کی گئی

کسی کی شادی میں شرکت، کسی کی بیماری میں عیادت، کسی کو ہدیہ، اور کسی کو پیغامِ خیریت، غرض ایک زندہ تعلق جو ایک برادری کے افراد میں ہوتا ہے، وہی تحریک کے لیے پائدار زندگی کی ضمانت ہے۔

کتاب و کاغذ سے کوئی مضبوط رشتے استوار نہیں ہوتے، بلکہ عمل و کردار سے رشتے قائم ہوتے ہیں۔ کتابیں الماری میں اکٹھی رہ کر بھی علٰحدہ رہتی ہیں اور انسان علٰحدہ گھروں میں رہ کر بھی ایک دوسرے کے دل کے قریب رہ سکتے ہیں۔ پائدار رفاقت تعلقات کی رفاقت ہی ہوتی ہے، ورنہ لوگ بچھڑتے ہیں تو باہمی شناخت و پہچان سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک اسلامی کا کارکن اپنے دور میں معاشرے کا ایک نہایت ہی قیمتی فرد ہوتا ہے اور جب وہ ایک نصب العین کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے تو اس کی گاڑی کو اپنی پوری قوت سے کھینچتا ہے اور اس کی کشتی کو اپنے بازوؤں کی پوری توانائی کے ساتھ بادِ مخالف کے پیدا کردہ گرد ابوں سے اعلیٰ درجے کی ہمت و جرأت کے ساتھ نکال لے جاتا ہے۔ ایسے کارکن اگر تھوڑی مقدار میں بھی کسی اسلامی تحریک میں جمع ہو جائیں تو وہ تاریخِ دعوت و عزیمت کا سرمایہ بن جاتے ہیں، اور اگر بڑی تعداد میں میسّر آ جائیں تو تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ کر اسے اپنے انقلاب کی منزل تک لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں

بقیہ اشارات:

جس طرح کہ دوسرے فرمانرداؤں کی گئی تھی۔ پھر ہم اس بات کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تحریک آزادیٔ فلسطین کی باقی چار تنظیموں کے رہنماؤں کو جو یاسر عرفات کی تنظیم سے کسی طرح کم مؤثر نہیں، کن مصالح کے تحت نظر انداز کر دیا گیا